کتاب نما

Iqbal's Reconstruction of Ijtihad' ڈاکٹر محمد خالد مسعود۔ ناشر: اقبال اکادمی پاکستان' لاہور۔ صفحات: ۲۴۶۔ قیمت: ۱۲۵ روپے۔

یہ کتاب مصنف کے تقریباً پندرہ برسوں کے مطالعے' غور و فکر اور تحقیق کا ماحصل ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۷ میں ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے ایک منصوبے کے تحت اقبال کے تصور اجتہاد پر تحقیق کا آغاز کیا تھا۔ جلد ہی انھیں 'فل برائٹ وظیفے پر امریکہ کے بعض کتب خانوں سے استفادے کا موقع ملا' جس کے نتیجے میں انھوں نے اس موضوع پر چند مقالات تیار اور شائع کرائے اور کولمبیا یونی ورسٹی میں منعقدہ ایک بین الاقوامی اقبال سیمینار میں بھی ایک مقالہ پیش کیا۔ ۱۹۸۰ میں اس موضوع پر ایک کتاب تیار کی جو ''اقبال کا تصور اجتہاد'' کے عنوان سے ۱۹۸۵ میں راولپنڈی سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی یہ موضوع برابر ان کے زیر مطالعہ رہا۔ اب انھوں نے اپنے نتائج تحقیق کو متعدد اضافوں کے ساتھ زیر نظر انگریزی کتاب میں مرتب کیا ہے۔

آٹھ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے اجتہاد کے مختلف مفاہیم' اس کے تاریخی پس منظر اور ارتقا اور مسائل اجتہاد پر سیر حاصل بحث کے بعد خطبات اقبال کے چوتھے خطبے The Principle of Movement in the Structure of Islam (اسلام میں اصول حرکت یا اجتہاد فی الاسلام) پر تفصیل سے معلومات فراہم کی ہیں۔ جس میں زیر بحث مقالے کی تیاری اور تحریر و ترتیب کی پوری تفصیلات بیان کی ہیں۔ بعد ازاں بتایا ہے کہ اقبال کے ہاں اجتہاد کا کیا مفہوم ہے' وہ اس کی کیا تعریف کرتے ہیں' اور قرآن' حدیث' اجماع اور قیاس کو مصادر اجتہاد کی حیثیت سے وہ کیا مقام دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد خالد مسعود کے خیال میں علامہ نے کئی برسوں کے غور و فکر اور تفکر و تدبر کے بعد یہ خطبہ پیش کیا' چنانچہ مسلم اہل فکر و دانش پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اقبال اجتہاد کو جامد مسلم معاشرے میں ایک حرکی اصول کے طور پر لیتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک یہ بات اس لیے اہم ہے کہ اقبال نے اجتہاد کی اہمیت پر اس زمانے میں زور دیا جب قدامت پرست حلقے اجتہاد کو ممنوع یا ناممکن قرار دیتے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اوائل میں علامہ اقبال بھی زمانہ انحطاط میں تقلید کوئی اجتہاد سے بہتر سمجھتے تھے۔"رموز بے خودی" (۱۹۱۸) میں کہتے ہیں:

اجتہاد اندر زمان انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہاد عالمان کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

(انحطاط کے زمانے میں اجتہاد، قوم کا شیرازہ بکھیر کر اس کی بساط لپیٹ دیتا ہے۔کوتاہ نظر عالموں کے اجتہاد سے اسلاف کی پیروی زیادہ محفوظ ہے)۔لیکن ابھی ایک عشرہ بھی نہیں گزرا تھا کہ انھوں نے عصری تقاضوں کا ادراک کرتے ہوئے، اپنا نقطہ نظر تبدیل کر لیا اور وہ اجتہاد کو مسلم معاشروں کی حیات نو کے لیے ضروری قرار دینے لگے۔

زیر نظر کتاب کے مصنف کہتے ہیں کہ مسئلہ اجتہاد کے سلسلے میں اقبال کو اس کی عملی مشکلات کا بخوبی احساس تھا، چنانچہ انھوں نے مجتہد کی اہلیت پر بھی بحث کی ہے۔ان کے خیال میں علما جدید علوم اور سائنس سے ناواقف ہیں اس لیے وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ عصر حاضر میں فرد واحد کے لیے معمولی سا اجتہاد کرنا بھی ممکن نہیں۔اسی لیے انھوں نے اجتہاد کی ذمہ داری افراد سے اداروں کی طرف منتقل کرنے کی تجویز پیش کی۔وہ کہتے ہیں کہ دور جدید میں منتخب نمایندوں پر مشتمل قانون ساز اسمبلی کو اجتہاد کی عظیم ذمہ داری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔اقبال کی دوسری تجویز یہ ہے کہ اجتہاد اور اجماع کو باہم مربوط کر دیا جائے۔مصنف کہتے ہیں کہ نفاذ اسلام کے سلسلے میں بھی اجتہاد کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے۔خصوصاً یہ امر کہ اجتہاد میں علما کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس کا حتمی فیصلہ آسان نہیں۔ایک رائے یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبر تو عوام کے نمایندے ہیں اور علما، اللہ اور رسولؐ کی نمایندگی کرتے ہیں۔مگر اس نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا آگے چل کر اس سے دین و دنیا کی تفریق کے رجحان کو تقویت نہ ملے گی؟ علامہ اقبال مسلم فکر کے اہم نمایندے ہیں۔بلاشبہ وہ ایک بڑے شاعر، بڑے مفکر اور بڑے انسان تھے۔بایں ہمہ انھوں نے اپنی رائے کی کامل صحت پر کبھی اصرار نہیں کیا تھا۔انھوں نے اجتہاد کے مسئلے پر بھی جو کچھ لکھا اسے اپنی تجاویز کے طور پر پیش کیا۔ڈاکٹر خالد مسعود کہتے ہیں کہ پاکستان اقبال کے خوابوں کی تعبیر ہونے کا دعوے دار ہے۔چنانچہ اس ملک پر اقبال کا حق بنتا ہے کہ اس کے افکار پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، ان پر علمی گفتگو ہو اور پھر حسب ضرورت انھیں بہتر شکل و صورت میں قبول کیا جائے۔

اقبال کے تصور اجتہاد کے سلسلے میں حالیہ برسوں میں اسمبلیوں کو اجتہاد کی ذمہ داری سونپنے کی بات بہت اچھالی گئی ہے، اس ضمن میں ایک بات تو یہ ہے کہ اول تو اقبال، اسمبلیوں کو اجتہاد کی کلی ذمہ داری نہیں سونپتے بلکہ وہ علما کی مشاورت اور شمولیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔دوسرے اسمبلیوں کی

جو موجودہ صورت حال ہے اور ارکان کا جو ذہنی اور تعلیمی اور اخلاقی معیار ہے' اقبال نے اس سطح کا کبھی تصور بھی نہ کیا ہو گا۔

ڈاکٹر خالد مسعود نے زیر بحث موضوع پر بڑی محنت اور دقت نظر سے تحقیق کی ہے۔ انھوں نے اقبال پر بعض مصری علما (سید قطب' محمد البہی) اور بعض مستشرقین کی تنقید پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے جملہ بنیادی اور ثانوی ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے بحث کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کا انداز و اسلوب عالمانہ اور متوازن ہے۔ گذشتہ چند برسوں سے اقبالیات میں خطبات اقبال کے مطالعے کا رجحان روز افزوں ہے۔ زیر نظر کتاب اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اقبال کے تصورات اجتہاد کے سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے زیر نظر کتاب ان سب میں مفصل' جامع اور اہم ہے۔ خوش آیند امر یہ بھی ہے کہ کتاب کی ترتیب و تدوین میں مصنف نے جدید ترین تحقیقی تقاضوں کا خیال رکھا ہے اور ناشر نے اسے نہایت اچھے معیار پر شائع کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب افکار اقبال پر مباحث میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

دارا شکوہ احوال و افکار' محمد سلیم۔ ناشر: مکتبہ کارواں' کچہری روڈ' لاہور۔ صفحات: ۱۷۲۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

دارا شکوہ تاریخ ہند اور مغل دور حکومت کا ایک اہم مگر متنازع کردار ہے۔ میں اپنے اس لائق فائق بیٹے کو تخت طاؤس پر متمکن دیکھنا چاہتا تھا مگر نیرنگی زمانہ دیکھیے کہ شاہ جہاں کی تمام تر خواہشات اور کوششوں کے باوجود دارا شکوہ ناکام رہا اور فرماں روائی اورنگ زیب عالمگیر کے حصے میں آئی۔ شہزادہ دارا شکوہ ۴۶ سال کی عمر میں قتل کر دیا گیا۔ زیر نظر کتاب میں مقتول شاہزادے کے حالات زندگی' اس کے علمی کام' سیاسی حکمت عملی اور مذہبی افکار کا بڑی خوبی' عمدگی اور مہارت کے ساتھ اور آسان زبان میں تعارف اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

مصنف دارا شکوہ کے افکار پر اپنا تبصرہ بھی پیش کرتے ہیں اور اس حوالے سے دارا شکوہ کی خوبیاں اور خامیاں بھی نمایاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ آخری باب بعنوان "شخصیت اور مذہب" ایک اعتبار سے زیر نظر مطالعے کا حاصل ہے۔ دارا شکوہ کی شخصیت "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" کا مصداق نظر آتی ہے۔ مصنف بتاتے ہیں کہ وہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ عالم' فاضل' صاحب ذوق' ذہین' نکتہ سنج' شیریں بیاں' حاضر جواب' فیاض' لیکن طبیعت کے بعض تضادات کی وجہ سے یہ خوبیاں اس کے کام نہ آسکیں' مثلاً وہ ان لوگوں کے لیے تحقیر کا اظہار کرتا تھا جو کسی معاملے میں اسے مشورہ دینے کی جرات کرتے۔ شاہزادگی نے اس کے اندر ایک گونہ کج خلقی پیدا کر دی تھی۔ وہ امرا کو دھمکیاں دیتا اور ان کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرتا۔ لوگوں سے غرور اور تکبر سے پیش آتا۔ چونکہ

شاہ جہاں کا سب سے لاڈلا تھا اس لیے اس کے اندر خود سری اور خوشامد پسندی راسخ ہوگئی تھی۔ اختلاف رائے اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس چیز نے اعیان سلطنت کو اس سے دور اور بد اعتماد کر دیا۔ شاہ جہاں کی نصیحتوں کے باوجود اس نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ مصنف نے اس کی شخصیت کے ایک دلچسپ تضاد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "ایک طرف تو دارا شکوہ صوفی ہونے کا دعوے دار ہے اور دنیا سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے مگر دوسری طرف وہ ہندستان کی حکومت کا تخت و تاج اپنے سر پر رکھنے کے لیے پوری کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں صوفیاے کرام کی پوری تاریخ میں ایک شخصیت بھی ایسی نہیں ملتی جس نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے جنگ یا جدوجہد کی ہو۔" (ص ۱۶۳)

دارا شکوہ کی ناکامی کا ایک سبب اس کے مذہبی افکار بھی تھے۔ اس کے علم و فضل، وسعت مطالعہ، دقت نظر اور شعر و ادب اور فنون لطیفہ سے اس کے فطری لگاؤ میں کلام نہیں۔ لیکن ایک تو خود ستائی، نام نہاد لبرل ازم اور بے باک خیالات اور دوسرے اپنے مرشد ملا شاہ سے اندھی عقیدت اسے گمراہی کے اس کوچے میں لے گئی کہ اس کی ذہانت و فطانت اور نہ شخصی خوبیاں اس کے کام آسکیں۔ اور مصنف کے بقول شاہ جہاں کے مسلمان امرا بھی دارا شکوہ کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ شاہ جہاں کے بعد بادشاہ بنے کیونکہ وہ ہندو مذہب سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اس نے نماز، روزہ اور شریعت کی طرف سے عائد کردہ دیگر ضروری فرائض ترک کر دیے تھے۔ اس کے افکار و اعمال سے یہ واضح ہو چکا تھا کہ اس کے تخت نشین ہونے پر اسلام کی نئی نئی تاویلیں ہوں گی۔ مسلمانوں کے اعتقادات پر زد لگائی جائے گی اور اکبر بادشاہ کا دور لوٹ آئے گا۔ (ص ۱۶۳)

حکیم الامت علامہ اقبال نے کیسی پتے کی بات کہی تھی؎

تخم الحادے کہ اکبر پرورید باز اندر فطرت دارا دمید

(اکبر نے الحاد کا جو بیج بویا تھا اور اس کی نشو و نما کی تھی وہ دوبارہ دارا شکوہ کی فطرت میں پھلنے پھولنے لگا۔)

ڈاکٹر محمد سلیم ایک ممتاز ماہر طبیعیات ہیں اور اس حوالے سے پنجاب یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ ایک مختلف علمی موضوع پر ان کی یہ کاوش بہت عمدہ، دلچسپ اور قابل تحسین ہے۔ کتاب سائنٹی فک انداز میں لکھی اور تیار کی گئی ہے۔ حوالوں اور حواشی، اشاریے اور بنیادی ماخذ کا پورا اہتمام موجود ہے۔ کتاب میں دارا شکوہ کی تصانیف و خطوط کی فارسی عبارتوں کا اردو ترجمہ بھی دیا جاتا تو بہتر تھا۔ طباعت اور پیش کش کا انداز بھی معیاری ہے۔ امید ہے علمی حلقوں اور عام قارئین میں بھی گرم دلی سے اس کتاب کا خیر مقدم ہوگا۔ (ر - ہ)

جماعت اسلامی کا تنہا مسافر، مولانا راحت گل۔ ناشر: مرکز علوم اسلامیہ پاکستان، راحت آباد، پشاور۔ صفحات: ۴۴۳۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

مولانا راحت گل نے اس کتاب میں جماعت اسلامی کے حوالے سے اپنی تمام یادداشتیں سند کے ساتھ تاریخ کے حوالے کر دی ہیں۔ جماعت کا رکن نہ ہونے کے باوجود، انھوں نے علماے سرحد میں جماعت کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے ان تھک کام کیا۔ انھیں جماعت سے کچھ اختلاف بھی رہا لیکن انھوں نے یہ بڑی خوش گوار روایت قائم کی ہے کہ اس ضمن میں مولانا مودودیؒ، میاں طفیل محمد اور قاضی حسین احمد کے نام اپنے اور ان کے جوابی خطوط سب شائع کر دیے ہیں۔ اگر سب تنہا بلکہ غیر تنہا مسافر اسی طرح اپنی اپنی روداد یں مرتب کر دیں تو قافلے کی تصویر واضح ہو جائے گی۔ (کتنے ہی لوگ اپنے سینوں میں یادوں کا اور خطوط کا ایک قیمتی سرمایہ لیے بیٹھے ہیں جس میں تاریخ کے کتنے ہی موڑ محفوظ ہیں۔) اس نوعیت کی کتاب (یہ دوسرا ایڈیشن ہے!) اگر کامیاب ہو سکتی ہے تو اسے دوسروں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہونا چاہیے۔

جماعت اسلامی اور علما کا اس کے ساتھ یا اس کا علما کے ساتھ رویہ تحقیق کا ایک بہت اچھا موضوع ہے کہ کوئی محقق اس پر غیر جانبداری سے کام کرے۔ قیام جماعت کے اولین روز سے آج تک اس میں اتار چڑھاؤ رہے ہیں اور دونوں طرف سے بہت کچھ لوازمہ موجود ہے۔ ابھی تو انٹرویو بھی لیے جا سکتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ کتاب قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے۔

مولانا راحت گل رابطہ مدارس عربیہ کے پہلے کنوینر تھے۔ چنانچہ رابطہ کے پہلے سات سال کی رپورٹ شامل کتاب ہے جس میں دس روپے چندہ دینے والوں کے نام بھی ہیں۔ لیکن "تنہا مسافر" کی یہ شکایت قابل توجہ ہے کہ اب رابطہ کی تاریخ میں ان کا ذکر ہی نہیں ہوتا۔

یوں تو یہ کتاب واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن ۲۳ اگست ۱۹۴۷ کو جامعہ کراچی میں مولانا مودودیؒ کے خطاب اور عبدالمالک مجاہد سے شفیع نقی جامعی کو صدارت کی منتقلی کی تقریب کا بیان بڑا ایمان افروز ہے۔ والی سوات اور جماعت اسلامی کے درمیان غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے ان کی کوشش، سالانہ اجتماع ۶۳ میں فائرنگ کے بعد بھی اس سلسلے میں مولانا مودودیؒ سے ان کی گفتگو لیکن پھر والی سوات کا بعض علما کی وجہ سے مولانا مودودیؒ سے برگشتہ ہی رہنا، اور ایسے کتنے واقعات اسے بڑی دلچسپ اور معلومات افزا کتاب بنا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مولانا راحت گل نے جماعت اسلامی کے لیے جو کچھ کیا، اس کا حال، جو خطوط لکھے، جو جواب ملے، جو رسالے میں اداریے لکھے، غرض ہر چیز ملے گی۔ (مسلم سجاد)

اردو، قومی یک جہتی اور پاکستان، ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان

کراچی۔ صفحات: ۱۶۷۔ قیمت: ۶۰ روپے۔

پاکستان میں ایک زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبول عام (اور اسی لیے اہم) زبان اردو ہے۔ اردو کی نشوونما میں اگرچہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ کوششیں شامل رہیں لیکن تاریخ کے ایک خاص موڑ پر ہندو اکثریت نے اس زبان کو محض اس لیے نشانہ بنایا کہ اس کا رسم الخط فارسی ہے اور اس کی ثقافتی اور لسانی فضا پر مسلم نقوش حاوی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اردو سے ہندوؤں کا عناد بڑھتا گیا اور یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کسی وقت آگے چل کر ہندو، مسلمانوں پر ہندی کو جبراً ٹھونسنے کی کوشش کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا مسئلہ مسلم لیگ کے مطالبات میں شامل کیا گیا اور جب پاکستان بنا تو اس کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد تنگ نظر عناصر اور انگریزی نواز موثر اقلیت نے اردو کی اس حیثیت کو متنازع بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ پہلے بنگالی کو اس کا مدمقابل قرار دیا گیا اور پھر پاکستان کی دوسری زبانوں کو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی کو پاکستان کے در و بام پر مسلط رہنے کا سنہری موقع میسر آگیا۔ اس صورت حال نے پاکستان کی آزادی اور استحکام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اردو کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کا سب سے زیادہ نقصان قومی وحدت اور یک جہتی کو پہنچا۔ علاوہ ازیں اس سے نہ صرف تعلیمی ترقی متاثر ہوئی بلکہ حکومت اور عوام کے درمیان بے اعتمادی اور نفرت کی وہ دیوار بھی حائل ہوئی جس نے اجتماعی ترقی کو مشکوک بنا دیا۔ لہٰذا اہل علم نے ہمیشہ یہ مطالبہ کیا کہ انگریزی کی بالادستی ختم کی جائے۔ اردو کو قومی اور سرکاری حیثیت سے ترقی دی جائے اور دوسری زبانوں کو ان کا جائز حق دینے میں بخل سے کام نہ لیا جائے۔

کون نہیں جانتا کہ اردو برعظیم ہی نہیں عالمی سطح پر بھی اہم مقام رکھتی ہے خصوصاً پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے باہمی رابطے کے لیے اس کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس میں سرکاری اور دفتری زبان بننے کی پوری صلاحیت ہے۔ جو لوگ اس کی صلاحیت اور استعداد کا انکار کرتے ہیں وہ محض تعصب و تنگ نظری کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ مختلف اہل علم نے ان لوگوں کے اعتراضات کے نہایت مدلل جوابات فراہم کیے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہایت عمدہ انداز میں اردو کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اردو کے نفاذ اور ترویج کی بدولت ہم قومی وحدت و یک جہتی حاصل کر سکتے ہیں اور پاکستان کو حقیقی معنوں میں پاکستان بنا سکتے ہیں۔

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوانات بالترتیب یوں ہیں: قومی یک جہتی کا پس منظر و محرکات، مسلمانوں میں یک جہتی کی تحریک کا آغاز، مسلم قومی یک جہتی کا ایک طاقتور محرک اردو، مسلم

قومی یک جہتی اور تحریک پاکستان، مسلم قومی یک جہتی اور تحریک پاکستان کے آخری دس سال۔ آخر میں پیر حسام الدین راشدی اور علامہ آئی آئی قاضی کے مقالے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کی عظمت کو ہر انصاف پسند عالم اور محقق نے خراج تحسین پیش کیا ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی خطے سے ہو۔ کتاب کا مقدمہ جمیل الدین عالی کے قلم سے ہے اور خاصے کام کی چیز ہے۔ کتاب کی ترتیب اور طرز استدلال موثر ہے اور اس امر کی ضرورت ہے کہ کتاب کو زیادہ پھیلایا جائے تاکہ اردو کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کر کے قومی یک جہتی کی راہ ہموار کی جاسکے۔ (رحیم بخش شاہین)

عورت، اپنی جنت میں، سید نظر زیدی۔ ناشر: مکتبہ ادب پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۲۲۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

سید نظر زیدی ہمارے بزرگ اہل قلم میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تقریباً نصف صدی سے موصوف کا قلم تاریخ، سیرت، ناول، افسانہ، تنقید، شاعری اور بچوں کے لیے نثر نگاری میں رواں ہے۔ ”عورت اپنی جنت میں“ ان کی تازہ کتاب ہے۔

ہمارے ملی اور معاشرتی زوال و انحطاط میں ایک بہت بڑا دخل اس بات کا بھی ہے کہ ہم نے طبقہ نسواں کے بارے اللہ اور رسول اللہؐ کی ہدایات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ”نصف بہتر“ کے مسئلے پر خدائی ہدایات سے روگردانی صریح کفر کے برابر ہے اور کفر کا انجام ہلاکت اور تباہی و بربادی ہے۔

جناب نظر زیدی نے اس مسئلے کا مکمل فکری و نظری، تاریخی اور معاشرتی جائزہ لیا ہے اور بڑے اعتدال اور راست فکری کے ساتھ عورت کے حقیقی مقام و مرتبے، خواتین کے دائرہ کار، مساوات مرد و زن اور دیگر متعلقہ پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے اور اس مسئلے کے حل کے لیے ہمارے بعض اکابر نے جو کوششیں کیں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ زمانہ حال کی ”اصلاح نسواں“ کی تحریکوں نے ”ترقی“ کے لیے عورت کی فطری شرم وحیا کو ختم کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ بقول مولانا مودودیؒ ”ترقی کا کوئی کام ان اہل مغرب، شیاطین اور ان کے شاگردوں کے ہاں شروع نہیں ہو سکتا جب تک عورت کو بے پردہ کر کے وہ بازار میں نہ لاکھڑا کریں اور اسے کسی نہ کسی طرح عریاں نہ کر دیں۔“ ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ طالبات سر کو سکارف سے ڈھانپیں۔ مغرب کی اس آزاد خیالی پر کسی نے بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے: free to bare but not cover (ننگا ہونے کی تو آزادی ہے مگر پردے کی پابندی ہے۔) انجام کار یہ راستہ تباہی و بربادی کا ہے۔ اس حوالے سے زیدی صاحب نے بالکل صحیح کہا کہ: ”مغرب کے زیر اثر طبقہ نسواں کی بھلائی کی تحریک کو ایسا رخ دیا جارہا ہے جو خود اس طبقے کے مصائب میں بھی اضافہ کرے گی اور معاشرے کی مصیبتیں بھی زیادہ ہوں گی۔“ کتاب کے پہلے ہی باب کا عنوان بہت معنی خیز ہے: ”عورت مرد کی رفیق یا فریق؟“ یعنی

اسلام نے تو عورت کو رفاقت کا درجہ دیا، مگر مغرب نے اسے فریق کا درجہ دے کر، مرد کا رقیب بنا دیا اور یوں ایک فتنے، مناقشے اور عداوت کا آغاز ہوا۔

نظر زیدی نے اپنے ماہرانہ تجزیے میں بڑا دھیما مگر موثر لہجہ اختیار کیا ہے۔ ان کی نظر مسئلے کے جملہ پہلوؤں تک گئی ہے اور مسئلہ زیر بحث واضح ہو کر اور نکھر کر سامنے آگیا ہے۔ تباہی اور بربادی کے جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اس سے بچنے کی "اگر کوئی صورت باقی ہے تو صرف یہ کہ نسل انسانی مکانوں اور جسموں کو سجانے کی بجائے دلوں اور روحوں کو سجانے پر زیادہ توجہ دے۔ یہ جو زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کرنے اور پھر اسے دوسروں کو تباہ کرنے کی دوڑ شروع ہوگئی ہے، اسے ختم ہونا چاہیے۔ اور اس مبارک کام کا آغاز ذی شعور خواتین بہتر طور پر کر سکتی ہیں"۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔ (ر-ه)

تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق، ڈاکٹر اکبر رحمانی۔ ناشر: ایجوکیشنل اکادمی اسلام پورہ، جلگائوں، بھارت۔ صفحات: ۱۳۴۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

خاندیش، مغربی بھارت کا ایک خطہ ہے جو ۱۹۶۱ کے بعد سے ضلع جلگاؤں اور ضلع دھولیہ میں تقسیم ہے۔ ڈاکٹر رحمانی نے اس خطے کی تاریخ سے متعلق، اپنے چند تحقیقی مضامین یکجا کیے ہیں۔ خاندیش میں مسلمانوں کا تناسب آبادی دس فیصد سے بھی کم تھا مگر پورے علاقے میں مدرسے اور دارالعلوم قائم تھے۔ ان میں برہان پور کا عظیم الشان مدرسہ خاصی شہرت رکھتا تھا۔ (اورنگ زیب کی داستان معاشقہ کے بارے میں چار مضامین ہمارے خیال میں کتاب کے موضوع سے غیر متعلق ہیں)۔ قارئین خصوصاً تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے زیر نظر کتاب کو معلومات افزا اور مفید پائیں گے۔ (ر-ه)

صبر، قرآن و حدیث کی روشنی میں، ڈاکٹر محمد ابراہیم عبدالسلام۔ ملنے کا پتا: ادارہ الحسنات منصورہ لاہور، ادارہ منشورات اسلامی بالمقابل منصورہ لاہور۔ صفحات: ۸۴۔ قیمت: ۲۰ روپے۔

صبر، قرآنی اور نبوی نیز انسانی اخلاق و اوصاف میں سے ایک نہایت ہی اہم وصف ہے۔ ڈاکٹر محمد ابراہیم عبدالسلام (استاذ سید مودودی بین الاقوامی تعلیمی انسٹی ٹیوٹ لاہور) نے بقول مولانا عبدالمالک: "صبر کے موضوع پر آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ، اقوال صحابہ و تابعین اور سلف و صالحین کے زریں اقوال کی روشنی میں سیر حاصل بحث ہے۔" اپنے موضوع پر ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ (ر-ه)